

سَلَامُ اللّٰهِ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلٰمٌ

نَظَرَاتُ

احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم اس امت کا ایک بیش قیمت ترین ورثہ ہیں، جس کی حسب استطاعت حفاظت ہم سب کا اولین فریضہ ہے۔ اور غور کیجئے تو اس امت مرحومہ کا سرمایہ حیات کیا ہے، سوائے اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی احادیث کے؟ ان میں سے اللہ نے اپنی کتاب کی حفاظت کا تو خود ذمہ اٹھایا ہے۔ اور اللہ کا یہ وعدہ جس طرح پورا ہوا وہ اسلام کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔ لیکن احادیث رسول اللہ کی حفاظت کا کام ہم سب امتیوں کے سپرد رہا ہے۔ ہم نے اسلام کی طویل تاریخ کے مختلف ادوار میں اسی امانت کے تحفظ و صیانت کے لئے مختلف طریقوں سے اور مختلف سطحوں پر کام کیا ہے۔ کبھی ہم نے اس میں نمایاں فتوحات حاصل کیں اور کبھی ہم نے سخت شکستیں کھائیں۔ کبھی ہم نے اس کی طرف وہ توجہ دی جس کا یہ عظیم سرمایہ مستحق ہے اور کبھی ہم نے اس سے وہ غفلت برتی جو ہمارے دعویٰ محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل منافی تھی۔ کبھی ہم نے اس کے ساتھ نادان دوستی برت کر اس میں سچ اور جھوٹ کی تلبیس کی راہ ہموار کی اور کبھی کھلی عداوت کا ثبوت دیتے ہوئے

صریح جھوٹ کی اس میں آمیزش کی۔ شرمناک بات یہ ہے کہ تاریخ اسلام کے شروع کے ادوار ہی میں مسلمان کہلانے والے بعض گروہوں نے اپنے سیاسی - اور ستم تو یہ ہے کہ بعض صورتوں میں ”دینی“ - اغراض کی خاطر اس میں افتراء و بہتان کی آمیزش کی وہ منظم کوششیں کیں کہ الامان و الحفیظ۔

لیکن جہاں ایک طرف حدیثیں وضع کرنے والے گروہ مصروف عمل تھے، وہاں ائمہ حدیث کھوٹے اور کھرے کی پہچان کے لئے بہترین خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ اس وقت محدثوں کے سامنے سب سے اہم مسئلہ حدیث کے راویوں کے معتبر یا غیر معتبر ہونے کا اور ان لوگوں کو جو اپنے اغراض فاسدہ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر افتراء باندھنے سے باز نہیں آ رہے تھے، سچے راویوں سے الگ کرنے کا تھا۔ چنانچہ ان محدثوں نے روایت اور اسناد کے علوم مدون کئے اور ان کی کسوٹی پر پرکھ کر احادیث کے صحیح یا غیر صحیح، قوی یا ضعیف وغیرہ ہونے کے اصول بنائے اور احادیث کے راویوں کی جرح و تعدیل یعنی تنقید کے لئے رجال کے عظیم الشان فن کی بنیاد رکھی۔ جس میں ایک لاکھ سے اوپر حضرات کی مختصر سوانح عمریاں منضبط کی گئیں۔ فی الحقیقت علم الرجال مسلمانوں کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات سے محبت کا سب سے شاندار ثبوت ہے۔ یہ ایک ایسا علم ہے جس کی نظیر دنیا میں مفقود ہے۔ اس پر ہم جس قدر ناز کریں بجا ہے۔

علم الرجال کے ذریعہ یہ متعین کیا جاسکتا ہے کہ اولاً، کسی حدیث کا کوئی راوی معتبر ہے یا نہیں۔ ثانیاً، جس راوی سے اس نے روایت کی ہے اور جس کو روایت کی ہے، ان دونوں سے اس کا ملنا ثابت ہے یا نہیں۔ کسی روایت کے جانچنے کے ابتدائی اصول کے لحاظ سے یہ معلومات یقیناً بہت ہی قیمتی ثابت ہوسکتی ہیں۔ اگر کسی خبر کا راوی غیر معتبر ہے یا جس سے وہ یہ خبر روایت کر رہا ہے، اس سے اس کے ملنے کا قرینہ موجود نہیں، تو ہم بہ آسانی اس خبر کو رد کرسکتے ہیں۔ روایت کے یہ اور ایسے ہی دوسرے اصول

بہت مفید ہیں اور جس زمانے میں یہ روایتیں جمع ہو رہی تھیں، ان پر عمل کرنا وقت کی اولین ضرورت تھی۔ چنانچہ ائمہ حدیث نے ایسا ہی کیا اور ان اصول کی بنا پر احادیث کے سیل بے پناہ پر بند باندھا۔ لکھو کھا احادیث میں سے انتخاب کر کے نسبتاً زیادہ قابل اعتبار احادیث کے مجموعے مرتب کئے۔ ان مجموعوں میں جن کو زیادہ قبول عام حاصل ہوا، وہ صحاح ستہ کے نام سے مشہور و معروف ہیں۔

روایت کے یہ اصول جن پر صحاح ستہ کی احادیث کی صحت مبنی ہے، اپنی جگہ کتنے ہی مفید کیوں نہ ہوں، لیکن یہ خود مکفی ہرگز نہیں ہو سکتے۔ اگر یہ معقول حد تک یقین کے ساتھ معلوم ہو جائے کہ کسی فعل یا قول کا راوی معتبر اور قوی الحافظہ ہے اور جن اصحاب سے وہ یہ فعل یا قول نقل کر رہا ہے، ان سے اس کا ملنا بھی ثابت ہو۔ تاہم ان کے محض ملنے کے امکان سے اس فعل یا قول کے صحیح نقل ہونے کا ثبوت نہیں فراہم ہو سکتا۔ اولاً، یہ عین ممکن ہے کہ دو راوی ایک دوسرے سے ملے ہوں، لیکن اس سے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ اس ملاقات میں ایک دوسرے سے کوئی فعل یا قول روایت کیا ہو؟ ہمارا علم الرجال اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ لیکن اس میں علم الرجال کا قصور ہرگز نہیں۔ اسکا احاطہ کرنا انسانی اختیار کی حد سے باہر تھا۔ ماہرین علم الرجال نے جو کچھ کر دکھایا ہے، وہ خود ما فوق العادت ہے لیکن ان سے ما فوق الامکان کی توقع رکھنا درست نہیں۔ ثانیاً، اگر ایک راوی نے دوسرے راوی سے فعل یا قول فی الواقع روایت کیا بھی ہو تو اس روایت کے پوری صحت کے ساتھ نقل ہونے کی کیا ضمانت ہے؟ ہم سب کا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ ایک واقعہ کو یا ایک قول یا تقریر کو متعدد معتبر اور قوی حافظہ والے اصحاب دیکھتے اور سنتے ہیں لیکن جب وہ اسکو دوسرے سے بیان کرتے ہیں تو اس میں نمایاں فرق آجاتا ہے۔ یہ سب عینی شاہد و سامع ہوتے ہیں۔ ان کے معتبر ہونے اور ان کے حافظے کے قوی ہونے کے بھی معقول وجوہ ہوتے ہیں۔ لیکن اسکے باوجود ان کے بیانات ایک دوسرے سے مختلف بلکہ کبھی معارض بھی ہوتے ہیں۔ علم الرجال یا فن روایت اس سوال کے جواب

سے بھی قاصر ہے۔ بلکہ یہ تو اس کے دائرے سے ہی خارج ہے۔ کیونکہ یہ سوال شہادت کا نہیں بلکہ قرائن کا ہے۔ روایت کا نہیں بلکہ درایت کا ہے۔

واقعات و اقوال کے صحت بیان کے جانچنے کے یہی دو اصول ہیں : شہادت یا روایت اور قرائن یا درایت۔ یہ دونوں اصول لازمی ہیں۔ ان میں سے اول الذکر کو اولیت حاصل ہے، لیکن صرف بہ اعتبار ترتیب نہ کہ بہ اعتبار مرتبہ، گرچہ بعض مواقع ایسے بھی آسکتے ہیں کہ بادی النظر میں قرائن ایسے موجود ہوں کہ شہادت یا روایت کے اصول پر جانچنے کی نوبت ہی نہ آئے، لیکن درایت یا قرائن کے اصول سے قطع نظر کسی حال میں نہیں کرسکتے۔ چنانچہ روایت کے ساتھ درایت کے اصول بھی ہمارے اسلاف کے پیش نظر یقیناً تھے، لیکن محض مجملاً۔ یہ بات تعجب کی نہیں ہے کہ ان میں سے جو فہم و بصیرت میں دوسروں سے آگے تھے انہیں عموماً درایت کے اصول پر زیادہ اصرار تھا۔ اس کی نمایاں مثال حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی ہے کہ وہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ و سلم کے معاملے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جیسے کثیرالروایت صحابیوں کے مقابلے میں روایت سے کہیں زیادہ درایت کے اصول کے پابند تھے۔ اسی طرح امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور سفیان ثوری رحمہ اللہ وغیرہ کے مقابلے میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا حال ہے۔ اگر بہ نظر غور دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرون اولیٰ میں روایت اور درایت کے اصول کی تثبیت و تاکید میں اس تفاوت کے لحاظ سے ائمہ متقدمین کے دو مستقل گروہ ہو گئے تھے جو (بالترتیب) اصحاب الحدیث اور اصحاب الرائے کہلائے۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ مؤخر الذکر گروہ کے ممتاز ترین فرد تھے۔ لیکن ان اصطلاحوں سے عموماً دھوکا یہ ہوا ہے کہ اصحاب الرائے حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کی حجیت کے تسلیم کرنے میں اصحاب الحدیث سے کسی طرح کم تھے۔ حالانکہ یہ بات راء صواب سے بہت دور ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں گروہوں کو اصحاب الروایت اور اصحاب الدرایت کہا جائے تو زیادہ صحیح ہے۔

بہ ایں ہمہ حدیث کی تدوین و تنقید کا کام بیشتر اصحاب الحدیث (یعنی اصحاب الروایہ) کے ہاتھوں میں رہا۔ اصحاب الرائے (اصحاب الروایہ) میں سے امام ابو یوسف رحمہ اور امام محمد الشیمانی رحمہ جیسے ائمہ نے اس طرف توجہ ضرور دی۔ لیکن اس سلسلے میں ان کی مساعی کو قبول عام نصیب نہیں ہوا اور واقعہ یہ ہے کہ یہ محرومی ہرگز بے سبب نہ تھی۔ حدیث کی تدوین و تنقید کے کام پر ”اصحاب الحدیث“ کہلانے والے بزرگوں کے چھا جانے سے ذخیرہ احادیث کے متن سے کہیں زیادہ ان کے اسناد پر اور درایت سے کہیں زیادہ روایت پر توجہ صرف کی گئی۔

صحاح ستہ کے مدون ہوجانے کے بعد، اغلب ہے کہ اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے طبقات متوسطین میں سے ابو بکر خطیب بغدادی (م ۴۶۳ ھ) اور ابن الجوزی (م ۵۹۷ ھ) جیسے محدثوں نے اور متاخرین میں سے ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ ھ)، سیوطی (۹۱۱ ھ) ملا علی قاری (م ۱۰۱۴ ھ) وغیرہ نے اپنی تصنیفات میں درایت کے اصول پر متن حدیث کی تنقید کے لئے بہت مفید اشارے دیے ہیں۔ ان میں سے ابن الجوزی اور ملا علی قاری کی ہدایات جو نسبتاً زیادہ مفصل اور واضح ہیں علامہ شبلی نعمانی نے اپنی کلاسیکی شہرت رکھنے والی تصنیف ”سیرۃ النبی“ کے مقدسے میں نقل کی ہیں۔ ہم ان کی کتاب کا یہ اقتباس ”انتخاب“ کے عنوان سے شایع کر رہے ہیں۔ اگر سطور مندرجہ بالا میں بتائے ہوئے اشارات کے مطابق محدثین سلف کی اصول حدیث (مصطلح الحدیث) کی تصنیفات کا استقصا کیا جائے تو علامہ شبلی کے پیش کردہ اقتباسات پر معتد بہ اضافہ ضرور کیا جاسکتا ہے۔ تاہم ان تمام کا مقابلہ اس عظیم و وسیع ادب سے کیا جائے جو روایت کے اصول اور رجال و اسانید کی تنقید کے سلسلے میں قدما سے لے کر متاخرین تک محدثوں نے تصنیف کر ڈالا ہے تو یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لئے روایت کے اصول پر جس قدر توجہ دی گئی ہے مشکل اس کا خفیف ترین جزو درایت کے اصول کے حصے میں آتا ہے۔

مسلمانوں کے علمی زوال نے درایت کے اصول پر احادیث کی نقد و حفاظت کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا - اس علمی زوال کا بڑا سبب سیاسی ادبار نہ تھا بلکہ وہ ناقص نظام تعلیم تھا جس کا فکر انگیز تجزیہ ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب نے اپنے اس پر مغز مقالے میں کیا ہے جو اس شمارے کی زینت ہے - اس نظام تعلیم سے یہ توقع ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ وہ درایت کے اصول پر حدیث کے حفظ و نقد کے ادھورے کام کو سر انجام دے سکتا - اس کا اثر تو اس کے برعکس یہ ہوا کہ روایت کے اصول کے تتبع نے آگے چل کر روایت پرستی کی شکل اختیار کر لی -

یہ ضرور ہے کہ درایت کے اصول پر احادیث کے حفظ و نقد کا کام بے حد دشوار، بہت محنت طلب اور سخت جرات آزما ہے - ابن الجوزی اور دوسرے محدثوں نے متن احادیث پر جرح و نقد کے لئے جو اشارات دئے ہیں، ان کی رہنمائی میں اصول درایت کو شرح و بسط سے قائم کرنا اور پھر ان کی بنیاد پر صحاح ستہ اور دیگر مجموعہ ہائے احادیث کا جائزہ لینا جوئے شیر لانا ہے - ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب نے اپنے مقالات میں جو اس ماہنامہ میں شائع ہوتے رہے ہیں، درایت کے اصول پر احادیث کے حفظ و نقد کے اس دشوار کام کے لئے چند راہیں سجھائی ہیں - ان کی یہ کوشش بعض لحاظ سے اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے، اس لئے اس میں خامیوں کا رہ جانا مستبعد نہیں - ان کا ازالہ علمی سطح پر تبادلهٔ خیالات سے ہی ہو سکتا ہے -

کیا ذات رسالت مآب سے محبت و شیفتگی کا یہ تقاضا نہیں کہ آپ کی طرف منسوب احادیث کے بارے میں ہمارے علمائے حدیث قدمائے محدثین کی کوششوں پر قناعت نہ کر بیٹھیں بلکہ خود محنت کریں اور درایت کے اصول سے کام لیتے ہوئے یہ معلوم کریں کہ ان کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف فی الواقع صحیح ہے یا نہیں؟ فہل من مدکر